قرآنی قصص کے مقاصد

حافظ محمد اسلم ○

قصص کے ساتھ انسان کا گہرا اور قدیم تعلق ہے۔ بچہ جب شعور کی دنیا میں آکر محسوسات و مرئیات میں دل چسپی لیتا ہے تو قصے کہانیاں سننے کا فطری جذبہ اس میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ ابتداً جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں اس کے ذوق کی تسکین بنتی ہیں۔ والدین' رشتے داروں اور دوستوں کی محفل میں رائج قصے اس کے ذہنی افق کو وسیع کرتے ہیں۔ پھر مطالعہ کتب کی شکل میں اسے قصص و تاریخ کا غیر متناہی سرچشمہ میسر آجاتا ہے جو اس کی علمی پیاس بھی بجھاتا ہے اور اخلاقی تربیت بھی کرتا ہے۔

یہ واقعات شخصیت سازی اور کردار کی تعمیر میں مخصوص کردار ادا کرتے ہیں۔ نیکوکار لوگوں کے قصے اسے نیکی کی طرف مائل کرتے ہیں' اور بدکردار لوگوں کے واقعات برائی کی ترغیب دیتے ہیں یا متنفر کرتے ہیں۔ گویا نیکی کی طرف مائل کرنے' بدی سے ہٹانے اور خیروشر میں تمیز پیدا کرنے کا یہ ایک فطری طریقہ ہے جو کسی قسم کی سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کے بغیر محض اندرونی تحریک سے پروان چڑھتا چلا جاتا ہے۔ خیر و اصلاح کی تلقین کرنے کے اس انداز میں جانوروں کی کہانیاں بھی ملتی ہیں' عام اور جلیل القدر انسانوں کے واقعات بھی۔ مگر مذہبی کتب بالخصوص قرآن مجید میں درج واقعات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

قصہ کا مفہوم

قصہ کے معنی ہیں: بات' خبر' واقعہ۔ اس کی جمع اقاصیص اور قصص بکسر القاف و فتح الصاد آتی ہے (لسان العرب' بذیل مادہ ق ص)۔ دور جاہلیت میں اس مقصد کے لیے اساطیر کا لفظ بولا جاتا تھا جس کا واحد اسطورہ ہے اور اس کے معنی ہیں: افسانہ' گھڑی ہوئی بات (فیروز اللغات' بذیل مادہ س ط ر)۔ مخالفین نے قرآنی قصوں کے لیے بھی یہی لفظ اختیار کیا۔ چونکہ یہ لفظ قرآنی قصص کے لیے بالکل غیر موزوں تھا اس لیے

○ اسسٹنٹ پروفیسر' گورنمنٹ کالج' بورے والہ

قرآن نے اس مفہوم کے لیے انباء کا لفظ اپنایا۔ مثلاً تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ (ھود ۱۱: ۴۹) یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی وحی ہم آپ کی طرف کرتے ہیں۔

انباء' نباء کی جمع ہے اور اس کا اطلاق ایسی خبر پر کیا جاتا ہے جس میں فائدہ عظیمہ ہو (روح المعانی' ۱: ۲۲۵)۔ چونکہ قرآنی اخبار عظیم فوائد پر مشتمل تھیں اس لیے قرآن نے اس لفظ کا انتخاب کیا۔

فن کتابت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اہل عرب کی روایات حافظے پر تھیں۔ یہ روایات نثر کے بجائے نظم میں تھیں۔ اس لیے ان کے حالات معلوم کرنے کا ذریعہ شعر تھا جیسا کہ مقولہ ہے: اَلشِّعْرُ دِيْوَانُ الْعَرَب۔ عرب شاعری کے متعلق حسن زیات کا خیال ہے کہ ان کا کلام قصص اور ڈرامائی شاعری سے خالی ہے (تاریخ ادب عربی' ۸۷)۔ مگر اس سے قصصی شاعری کی کلیتاً تردید نہیں ہوتی کیونکہ اسی کتاب میں جب ہم عرب کے مشہور شاعر امیہ بن الصلت کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا طبعی رجحان دینی مضامین کی طرف تھا اور اس سلسلے میں اس نے کافی شہرت حاصل کی تھی۔ یہی دینی رنگ اس کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے جلال کا وصف بیان کرتا ہے' حشر اور اس کے بھیانک واقعات کا ذکر کرتا ہے' جنت' جہنم اور فرشتوں کے حالات بیان کرتا ہے اور تورات کے واقعات مثلاً سدوم کا خرابہ اور حضرت اسحاق و ابراہیم علیہما السلام کے قصے نظم کرتا ہے (ایضاً' ۱۴۷)۔

اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: پہلی یہ کہ عربی شاعری میں قصص کا عنصر موجود تھا۔ دوسری یہ کہ قصص کے ساتھ رشد و ہدایت کا تعلق بھی تھا۔ یعنی اسے نصیحت آموزی کے لیے اختیار کیا جاتا تھا۔ اس کی تائید ابن ہشام کے اس بیان سے ہوتی ہے:

> حضور علیہ السلام کی بعثت سے قبل عرب میں تاریخ کا وجود نہ تھا۔ تاہم دور جاہلی کے کچھ واقعات صدری روایات کی شکل میں موجود تھے۔ نیز سد مارب کا واقعہ اور اس کے نتیجے میں لوگوں کے بکھر جانے کے قصے تحریری صورت کے بجائے زبانی شکل میں چلے آرہے تھے (ابن ہشام' ۱: ۴)۔

پھر اسی بحث کی تشریح جرجی زیدان سے حاصل ہوتی ہے:

> ابتداً عربوں نے قصص کا اہتمام نہیں کیا۔ بعد ازاں فارسی ادب سے کلیلہ دمنہ' کتاب رستم و اسفندیار' ہندی ادب سے سندباد الکبیر والصغیر حاصل کیں۔ یہ ان کا منقولہ ادب تھا۔ اپنے ادب میں عنترہ (مشہور جاہلی شاعر) اور الف لیلۃ نے خصوصی مقام حاصل کیا (تاریخ ادب اللغۃ العربیۃ' ۲: ۳۳۷)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی تبلیغ کے سلسلے میں گذشتہ امتوں کے واقعات بطور عبرت و موعظت سنائے تو اہل مکہ نے قرآن مجید کی عمومی تعلیمات کی مانند ان قصص کی بھی تکذیب و تضحیک کی

اور کہا: مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ○ (احقاف ۴۶: ۱۷) یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔ پھر ان قصص کی عظمت و اہمیت ختم کرنے کے لیے انھوں نے ایک حربہ یہ اختیار کیا کہ نضر بن حارث نامی ایک شیطان صفت قریشی کو آگے کیا جو حیرہ سے آیا تھا۔ وہاں اس نے ایرانی بادشاہوں کے واقعات اور رستم و اسفندیار کے قصے معلوم کیے تھے۔ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں وعظ و نصیحت کرتے، گزشتہ امتوں پر عذاب الٰہی کے واقعات سناتے، تو یہ ان کے پیچھے پہنچتا اور کہتا: "میں ان سے بہتر واقعات سنا سکتا ہوں، میری طرف آؤ" (ابن ہشام ۱: ۳۰۰)۔

اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ نزول قرآن کے وقت اہل عرب قصص سے آشنا تھے اور ان کی نظم و نثر میں اس کا وجود تھا، گو قلیل پیمانے پر تھا۔ بہرحال یہ قصص دنیا کی ہر قوم، ملک، مذہب اور الہامی کتب میں موجود ہیں اور مخصوص مقاصد کے حامل ہیں۔ مثلاً:

کہانیاں اور قصے لکھنا ادب کے گراں قدر فنون میں سے ایک فن ہے۔ اس کے ذریعے فکر کو تفریحی باتوں میں مشغول کر کے، نفس کی کدورت دور کی جاتی ہے اور اسے آرام پہنچایا جاتا ہے۔ نیز پُرحکمت باتوں سے عقل کی اصلاح و تربیت کی جاتی ہے (تاریخ ادب عربی، ۵۱۴)۔

اس اعتبار سے قصے کے دو مقاصد ٹھہرتے ہیں۔ ایک، ذہنی تفریح، یعنی تھکاوٹ اور کدورت کا خاتمہ کرنا، دوسرے، پُرحکمت باتوں سے عقل کو جلا بخشنا۔ قرآنی اعتبار سے قصص کے مقاصد کی تشریح یہ ہے:

قصص سے مراد بطور ارشاد و نصیحت، تفسیر، تاریخ و وقائع کا بیان ہے۔ اس میں علم اول کا کچھ حصہ بھی شامل ہے۔ جس سے وہ معلومات مراد لی جاتی ہیں جو پہلی امتوں کی سرگزشت اور انبیا کے واقعات نیز پہلے زمانے کے ڈراووں اور پیش گوئیوں پر مشتمل ہیں جسے اسلام قبول کرنے والے اہل کتاب بیان کریں۔ مثلاً عبداللہ بن سلام، کعب الاحبار، وہب بن منبہ وغیرہ..... وہب بن منبہ کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ انھوں نے اسلام میں سب سے پہلے انبیا کے قصے لکھے (ایضاً، ۱۷۵)۔

جہاں تک قرآن مجید کے قصص کی بحث ہے تو اس میں متعدد اقسام کے واقعات ہیں۔ پہلے، حضرت آدم علیہ السلام، ملائکہ اور ابلیس کا قصہ ہے۔ پھر ان چھ قوموں کے قصص ہیں جن پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ یعنی قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب، قوم موسیٰ و فرعون (ھود ۱۱: ۲۴-۹۸)۔ دوسرے، حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یونس، حضرت ایوب، حضرت زکریا اور حضرت عیسیٰ یعنی انبیا علیہم السلام کے قصص ہیں (انبیا ۲۱: ۵۱-۹۰)۔ تیسرے، غیر انبیا میں سے طالوت، مریم، ذوالقرنین، اصحاب کہف، اصحاب سبت، سیل عرم کے واقعات ہیں۔ چوتھے وہ قصے ہیں جو اشارتی انداز میں ہیں یعنی اصحاب قصص کے نام مذکور نہیں۔ مثلاً خضر، عزیر، سموئیل، ہابیل و قابیل وغیرہ۔

قرآنی قصص اور تاریخ نگاری میں فرق

۱- ایک مؤرخ جب واقعات کو ترتیب دینے لگتا ہے تو اس کے تمام اجزا اور حصص کو پیش کرتا ہے کیونکہ اس کے کمال فن کا تقاضا ہے کہ کوئی قابل قدر جزو چھوٹنے نہ پائے۔ مگر قرآنی قصص اس سے مختلف چیز ہیں۔ قرآن رشد و ہدایت کی کتاب ہے، تاریخ کی نہیں۔ اس لیے وہ اپنے بیان میں قصص کے صرف ایسے اجزا کا انتخاب کرتا ہے جو ہدایت کے حامل ہوں۔ یعنی عقائد کی تبلیغ، احکام و مسائل کا بیان، اخلاق حسنہ کی تلقین، انبیا کی تبلیغی مساعی، قوم کی تکذیب پر عذاب الٰہی کا نزول وغیرہ۔ جو اجزا غیر ضروری ہوں، قرآن ان سے احتراز کرتا ہے۔ جس کا نمونہ حضرت یوسف کی زبانی پیش کیا۔ آپ نے کہا: وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ (یوسف ۱۲:۱۰۰) قید سے نکالنے کے بعد میرے ساتھ عمدہ سلوک کیا۔ یعنی حضرت یوسفؑ نے قصہ کی پوری تفصیل بیان کرنے کے بجائے صرف انجام کا ذکر کر کے بات ختم کر دی۔ اگرچہ وہ تفصیل ایک مؤرخ کی نگاہ میں نہایت وقیع تھی۔

۲- قرآن اپنے اسلوب بیان میں شجرۂ نسب بیان نہیں کرتا۔ کیونکہ نسب ناموں کا ذکر اس کے عظیم مقصد سے ہم آہنگ نہیں بلکہ اس کے مقاصد کے خلاف ہے۔ البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ وجہ یہ تھی کہ آپ کی تخلیق خلاف معمول یعنی بن باپ ہوئی تھی اس لیے آپ کی ماں کی نسبت کا ذکر کیا تاکہ اللہ کی قدرت کا اظہار ہو۔

قرآن مجید نے انبیا علیہم السلام کا ذکر ان کے حقیقی ناموں سے کیا جب کہ مخالفین کا ذکر ذاتی ناموں کے بجائے وصفی ناموں سے کیا، مثلاً فرعون، وصفی نام تھا جبکہ اصل نام رعمسیس تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح، جب کہ وصفی نام آزر تھا۔ صفاتی نام ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ راہ حق قبول نہ کرنے کی وجہ ان کی یہ صفات تھیں۔ فرعون مصر کے ایک دور کے حکمرانوں کا لقب تھا، وہ شریر تھے اس لیے بعد میں فرعون سرکش کے معنی میں مستعمل ہونے لگا۔ آذر کا مطلب ہے بت فروش اور یہی چیز اس کی گمراہی کا باعث رہی۔

۴- قرآن نے عورتوں کو ذاتی ناموں کے بجائے خاوندوں کی نسبت سے پکارا۔ مثلاً فرعون کی بیوی، لوط کی بیوی، البتہ حضرت مریم کا نام مستثنیٰ ہے۔ وجہ یہ کہ وہ کنواری تھیں، خاوند کی نسبت سے ذکر کرنا ممکن نہ تھا۔ اگرچہ ان کی قوم نے "اے ہارون کی بہن" کہہ کر پکارا (مریم ۱۹:۲۸) اور قرآن نے اس جملے کو نقل کیا لیکن اگر قرآن اس نام سے پکارتا تو مفہوم واضح نہ ہوتا۔ کیونکہ ہارون نام کے متعدد افراد گزر چکے تھے جس کی وجہ سے تعیین نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے معاملے میں قرآن کس قدر حساس ہے۔

۵- قرآن اپنے بیان میں اعداد و شمار سے گریز کرتا ہے یعنی قبیلے کی تعداد یا قوم کی گنتی نہیں بتاتا۔ البتہ قوم ثمود کے ۹ افراد کا واقعہ (النمل ۲۷:۴۸) مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح قرآن مجید زمانی مدت بھی بیان نہیں کرتا۔ تاہم تین مقامات پر یہ گنتی موجود ہے۔ یعنی نوح علیہ السلام کی عمر ۹۵۰ سال بتائی (العنکبوت ۲۹:۱۴)' تاکہ ان کی طویل تبلیغی مساعی اور صبرو استقلال سے آگاہی ہو۔ اصحاب کہف کی ۳۱۰ سالہ طویل نیند کے بعد بیداری اور حضرت عزیر کی ۱۰۰ سالہ وفات کے بعد زندہ ہونے کا ذکر کیا (البقرہ ۲:۲۵۹)' تاکہ حیات بعد الممات جیسے اہم عقیدے پر استدلال ہو۔

۶- قصص کے اہم اجزا کے علاوہ قرآن مجید' ان پیغمبروں کے قیمتی خطبات اور پُراثر دعائیں بھی نقل کرتا ہے جو قرآنی تعلیمات کا مغز ہیں۔ مثلاً سورہ ابراہیم آیت ۱۴ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں' سورہ یوسف آیت ۴۰ میں آپ کا وعظ اور پھر آیت ۱۰۱ میں آپ کی دعا۔

اس کے برعکس اگر ہم بائبل کا مطالعہ کریں' تو وسیع پیمانے پر سلسلہ ہائے نسب دیکھتے ہیں جب کہ اعداد و شمار کی اس قدر بہتات ہے کہ اس کتاب کے جز نمبر ۴ کا نام ہی گنتی رکھ دیا گیا کیونکہ اس میں اعداد و شمار ہی پیش کیے گئے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ کتابیں قصوں کی غیر ضروری تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔ مگر جو چیزیں اخلاقی قدروقیمت رکھتی ہیں اور جن سے انبیا علیہم السلام کی اصل تعلیمات' حقیقی مشن اور سیرتوں کے سبق آموز پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے' ان کتابوں کا دامن ان سے خالی ہے (تفہیم القرآن' زیر آیت سورہ یوسف ۱۲:۱۰۰)۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف رخ کرتے ہیں یعنی قصص کے مقاصد۔

قرآن بنیادی طور پر رشد و ہدایت کی کتاب ہے جیسا کہ مختلف مقامات پر خود قرآن نے اپنا تعارف کرایا ہے۔ دنیا میں ہدایت کے بہت سے سرچشمے ہیں۔ مگر یہ بات مسلمہ ہے کہ اس کا تعلق جس قدر اعلیٰ ذات سے ہوگا' ہدایت بھی اسی قدر اعلیٰ و ارفع ہوگی۔ قرآن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا اور نہایت محفوظ ہاتھوں سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا۔ پھر اس کا تعلق اگر سلیم الطبع لوگوں سے ہو تو وعظ و نصیحت کا انداز ہے اور اگر اس کا سامنا ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہو تو عبرت آموزی کا طریقہ ہے۔ چونکہ قرآن اول و آخر ہدایت ہے اس لیے قصص کا بنیادی مقصد و محور بھی یہی ہے۔ بلکہ اس ہدایت کی بعض ایسی جزئیات ہیں جو صرف قصص سے ہی سامنے آتی ہیں۔

۱- عقائد میں اولین توحید ہے۔ قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیا نے اپنی دعوت و تبلیغ کا آغاز اسی پیغام سے کیا۔ پھر اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کیا (شعراء)۔ اس طرح اسلام کے پہلے دو عقائد کا اثبات ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں نزول تورات کا صریح بیان ہے جس سے تیسرے عقیدے کا

ذکر ہو گیا۔ سورہ ہود' آیت ۷۰ میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے پاس فرشتوں کی آمد کا ذکر ہے۔ نیز سورہ مریم آیت ۱۹ میں حضرت مریم کے پاس بھی انسانی شکل میں فرشتے کی آمد ہوتی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ملائکہ باقاعدہ جسمانی وجود رکھتے ہیں' اپنی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں (روح المعانی' ذیل آیت سورہ مریم ۱۹)۔ وہ محض پیغام رسانی کی کسی کیفیت و حالت کا نام نہیں۔ نیز عذاب اور دیگر مختلف فرائض سرانجام دیتے ہیں (ھود ۱۱:۸۱)۔ سورہ مومن آیت ۴۶ سے فرعون کے عذاب قبر اور سورہ نوح سے بھی عالم برزخ میں آگ کے عذاب کا ذکر ہے۔ سورہ یونس آیت ۹۱ سے پتا چلتا ہے کہ آخر وقت میں ایمان لانا غیر معتبر ہے (ایضاً' ذیل سورہ یونس ۹۱)۔

۲- اسلام کی ایک اہم تعلیم نسلی تفوق کا خاتمہ ہے۔ یہود دعوے دار تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ قرآن نے سبت کی بے حرمتی کرنے پر بندروں کی شکل میں مسخ ہونے کا قصہ بیان کر کے ان کی نسلی برتری کا زعم پاش پاش کر دیا کہ کوئی قوم اللہ کی لاڈلی نہیں۔ اللہ کے ہاں نجات کا مدار صرف اعمال ہیں۔ اسی طرح پسرنوح کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا انصاف کس قدر بے لاگ ہے۔ مشرکین مکہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کیسے ہی اعمال کریں مگر ہم پر خدا کا عذاب نازل نہیں ہوگا کیونکہ ہم ابراہیم کی اولاد ہیں اور فلاں فلاں دیوتاؤں کے متوسل ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بھی کچھ ایسے گماں تھے اور بہت سے مسلمان بھی اسی قسم کے تکیے کیے ہوتے ہیں کہ ان کی سفارش ہم کو خدا کے انصاف سے بچالے گی۔ لیکن یہاں یہ منظر ہے کہ جلیل القدر پیغمبر کی معافی کی درخواست ہے لیکن دربار خداوندی سے سرزنش کی جاتی ہے۔ باپ کی پیغمبری' بدعمل بیٹے کو نہیں بچا سکتی (تفہیم القرآن' ذیل سورہ ھود ۴۶)۔

تخت بلقیس لانے کے واقعے سے علم کی برتری واضح ہوتی ہے کہ صاحب علم نے پلک جھپکنے میں تخت لا کر حاضر کر دیا جبکہ طاقت ور جن کو اس کام کے لیے زیادہ وقت درکار تھا۔

قصص کے ذریعے فقہی رہنمائی بھی ہوتی ہے' کیونکہ قرآن اپنے قصص و اخبار کو آیات بھی قرار دیتا ہے۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ○ (یوسف ۱۲:۷)۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے بقول یہ واقعہ ایسے امور پر مشتمل ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی بڑی نشانیاں اور تحقیق کرنے والوں کے لیے بڑی بڑی ہدایتیں اور احکام و مسائل ہیں (معارف القرآن' ذیل آیت بالا)۔ آیات کا مطلب احکام و مسائل لینا اس لیے بھی صحیح ہے کہ خود قرآن نے بھی اس لفظ کو احکام کے معنی میں استعمال کیا ہے' مثلاً: لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ ...... كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (المائدہ ۵:۸۹)۔ اس جگہ آیات سے مراد احکام و مسائل ہی ہیں جن کا تعلق قسم کے ساتھ ہے۔

اسی طرح ابوبکر جصاص' بسم اللہ کی تشریح میں لکھتے ہیں: وھو اذا کان خبرًا فانہ یتضمن معنی الامر

..... لان اللّٰہ اخبرنا بہ لنفعل مثلہ (احکام القرآن للجصاص، ذیل بسم اللہ)۔ یہ اگرچہ خبر ہے مگر حکم کے مفہوم کو شامل ہے..... اس لیے کہ اللہ نے اس کی خبر اسی لیے ہم کو دی ہے تاکہ ہم بھی اس کی مثل کام کریں۔ معلوم ہوا کہ قرآنی اخبار کو مسائل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

بہرحال قصص آیات سے احکام کا استنباط کرنا اصول فقہ کا موضوع ہے۔ پھر سابقہ شرائع کی حجیت ایک متنازعہ بحث ہے۔ تاہم ترجیح اسی موقف کو حاصل ہے کہ سابقہ شرائع کے وہ احکام جو قرآن مجید میں مذکور ہیں، یا قرآنی واقعات سے اخذ ہوتے ہیں، وہ حجت ہیں، بشرطیکہ منسوخ نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی طرز کی تفاسیر نے بکثرت ایسے مسائل استنباط کیے ہیں۔ مثلاً احکام القرآن للجصاص اور الجامع لاحکام القرآن للقرطبی وغیرہ۔ جب کہ غیر فقہی تفاسیر نے بھی متعدد قصوں سے فقہی مسائل اخذ کیے ہیں مثلاً تفسیر کبیر ایک کلامی طرز کی تفسیر ہے۔ اس کے مؤلف امام رازی قصہ طالوت سے استنباط کرتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے عقیدے کی تردید کرتی ہے۔ جو کہتے ہیں کہ امامت موروثی چیز ہے (تفسیر کبیر، البقرہ ۲:۲۴۷)۔ اسی طرح روح المعانی بھی غیر فقہی تفسیر ہے مگر طالوت و جالوت کے اسی قصے میں لکھتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ پچھلی امتوں میں قتال کا حکم تھا، تمھارے لیے کوئی نیا حکم نہیں (روح المعانی، البقرہ ۲:۲۵۱)۔

قصص سے فقہی رہنمائی حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ "آیات احکام کی تعداد ۵۰۰ ہے اور آیات قصص کی تعداد ۱۰۰۰ ہے (سواطع القرآن ۲۷۴)۔ پھر جس طرح احکامی آیات میں عبارۃ النص سے مسائل حاصل کرنے کے علاوہ اشارۃ النص اور دلالۃ النص سے بھی بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں اسی طرح آیات قصص سے بھی متفرق قسم کے مسائل اشارۃ النص اور دلالۃ النص کی طرز پر حاصل ہو سکتے ہیں اور اس سے قرآنی فقہ کا دامن وسیع ہو سکتا ہے۔

منکرین کی عبرت آموزی کے لیے قرآن مجید نے مختلف قوموں کی تباہی کا قصہ مختلف سورتوں میں دہرایا اور پھر کہا: کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے (القمر ۵۴:۵۱)۔ اس انداز کو اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے لوگ تاریخی ذہن اور قصصی مزاج کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ تعلیمات کے بجائے واقعات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی تفہیم کے لیے قرآن نے سابقہ انبیاے کرام اور گذشتہ امتوں کے واقعات سنائے تاکہ منکرین کے خوفناک انجام سے آگاہ کر کے ان کے فکر و شعور کو جنجھوڑا جائے کہ ذرا غور کرو کہ جن قوموں نے اپنے انبیا کی تعلیمات کو جھٹلایا وہ کس طرح تباہ و برباد ہوئیں۔ قصص سے عبرت و موعظت کا یہ قرآنی انداز، استقرائی نوعیت کا تھا اور حسی بھی۔ کیونکہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے یمن اور شام کی طرف جاتے ہوئے عذاب زدہ قوموں کے کھنڈرات سے گزرتے تھے۔ یہ ان کی مرئی عبرت کا ساماں تھا جیسا کہ ارشاد ہے: وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۝ وَبِالَّيْلِ ؕ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۳۷-۱۳۸) بے شک تم

ان پر صبح و شام گزرتے ہو۔

قصص کو بطور نصیحت پیش کرنا کوئی نئی چیز نہیں۔ اخلاقی کہانیاں' جانوروں اور پرندوں کے قصے آج بھی ہماری کتابوں کی زینت اور تعلیمی نصاب کا حصہ ہیں۔ مگر قرآن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ فرضی اور خیالی کہانیوں کے بجائے حقیقی واقعات پیش کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسانوں کی رہنمائی کے لیے اعلیٰ انسانوں یعنی انبیا و صلحا کے واقعات گوش گزار کرتا ہے۔ بعض جگہ پرندوں کے قصوں سے بھی رہنمائی کی گئی ہے۔ آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تو اس نے لاش دفن کرنے کا طریقہ ایک کوے سے سیکھا۔ (روح المعانی' المائدہ ۵:۳۱)۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں "ھدھد" کی پیغام رسانی کا تذکرہ اور وادی نمل میں چیونٹی کی تقریر کا تذکرہ نہایت عبرت آموز ہیں (النمل :۱۸-۲۱)۔

قرآنی عبرت آموزی کا ایک رخ یہ ہے کہ اس کے قصص اپنی جزئیات و خصوصیات کے اعتبار سے مثالی مقام رکھتے ہیں مثلاً غرور و تکبر میں ابلیس کا گھناؤنا کردار ہے کہ خدا کے سامنے اکڑ گیا۔ تبلیغ کے طویل دورانیہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی عظیم ذات ہے جنھوں نے ۹۵۰ سال عمر پائی۔ قد کاٹھ اور جسمانی قوت میں قوم عاد کی مثال ہے جن کی مثل پھر پیدا ہی نہیں کیے گئے (الفجر ۸۹:۸)۔ ظلم و ستم میں فرعون کا بہیمانہ کردار ہے کہ بنواسرائیل کی مکمل نسل کشی کا منصوبہ شروع کیا ہوا تھا (البقرہ ۲: ۴۹)۔ نشہ توحید سے سرشاری میں حضرت ابراہیمؑ روشنی کا مینار ہیں جنھوں نے بت کدہ میں داخل ہو کر تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ وسعت سلطنت میں ذوالقرنین کا قصہ ہے جس کی سلطنت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ شدت عذاب میں قوم لوط کا واقعہ ہے جن کا مسکن (یعنی بحیرہ مردار) آج بھی زندہ عبرت بنا ہوا ہے۔ کثرت دولت میں قارون ضرب المثل ہے۔ یہ ہیں وہ قرآنی قصے' جو عبرت آموزی کا ایک جامع سلسلہ ہیں۔

اسی عبرت کا ایک منظر یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے مخالفین' یعنی اہل مکہ خود ان قصوں کی نظیر بن گئے۔ جنگ بدر میں کفار مکہ کے تمام سردار مارے گئے۔ اس طرح فرعون اور اس کے لشکر کی تباہی کا قصہ ان پر منطبق ہو گیا۔ فتح مکہ کے موقع پر برادران یوسف کی تاریخ دہرائی گئی جب حضور علیہ السلام فاتحانہ حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے اور اپنے نسلی بھائیوں کو یہ کہہ کر معاف کر دیا: جاؤ تم آزاد ہو۔ آج تم پر کوئی الزام نہیں (تفہیم القرآن' مقدمہ سورہ یوسف)۔

دلیل نبوت

قدیم زمانے سے یہ معمول چلا آ رہا ہے کہ جب بھی کوئی شخص اپنی کسی خصوصی حیثیت یا منصب کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے ثبوت کے لیے کسی نشان' سند' حکم نامہ' تمغہ وغیرہ کو پیش کرتا ہے' ورنہ اس کا قول غیر معتبر سمجھا جاتا ہے۔ انبیا کرام کی عمومی تاریخ سے بھی یہی صورت حال سامنے آتی ہے کہ جب بھی

انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، ان کی قوم نے کسی نشان کا مطالبہ کیا مثلاً حضرت ھود علیہ السلام کی قوم نے کہا "اے ھود، تم کوئی دلیل نہیں لائے۔ تمہارے کہنے پر ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑیں گے" (ھود ۱۱:۵۳)۔ اسی طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی تو جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نشانات دکھلائے (الاعراف ۷:۱۰۶)۔

حضورؐ نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ کیا تو اس وقت ہر طرف آپؐ کی صداقت و امانت کا شہرہ تھا، اور یہی آپؐ کی نبوت کی واضح دلیل تھی کہ جو شخص اپنی عمومی زندگی میں جھوٹ نہیں بولتا، وہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں جھوٹ کا ارتکاب کس طرح کر سکتا ہے۔ تاہم خدا تعالیٰ نے صحیح واقعات کے بیان کو آپؐ کی نبوت کی دلیل ٹھیرایا۔ یہ آپؐ کے لیے معجزات بھی تھے، آپؐ کی شان اور وقار بھی (تفسیر کبیر، زیر آیت سورہ طٰہٰ ۲۰:۹۹)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین آپؐ کی نبوت کی صداقت کے لیے آپؐ سے من مانے مطالبات کرتے۔ بالخصوص ان کا مطالبہ حسی معجزات کے متعلق ہوتا۔ مثلاً زمین سے چشمہ نکالو، کھجور اور انگوروں کے باغات ہوں جن میں نہریں چلتی ہوں، فرشتوں کی فوج آئے، غیبی خزائن، آسمان پر چڑھنا وغیرہ (بنی اسرائیل ۱۷:۹۲) مگر قرآن نے اس قسم کے مطالبات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ البتہ جب انھوں نے مختلف تاریخی شخصیتوں کے بارے میں سوالات کیے تو قرآن نے ان کی تفصیلات بیان کیں۔ سورہ یوسف کا شان نزول بھی اسی قبیل سے ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس کے مقاصد نزول میں لکھتے ہیں "ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت اور وہ بھی مخالفین کا اپنا منہ مانگا ثبوت بہم پہنچایا جائے، اور ان کے تجویز کردہ امتحان میں یہ ثابت کیا جائے کہ آپؐ سنی سنائی باتیں بیان نہیں کرتے بلکہ فی الواقع آپؐ کو وحی کے ذریعے علم حاصل ہوتا ہے" (تفہیم القرآن، مقدمہ سورہ یوسف)۔

اس مفہوم کی مزید تائید طالوت اور جالوت کے قصے سے ہوتی ہے کہ اختتام واقعہ پر ارشاد باری ہے: تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ (البقرہ ۲: ۲۵۲) یہ اللہ کی آیات ہیں جنھیں سچائی کے ساتھ ہم بیان کرتے ہیں۔ بے شک آپؐ رسولوں میں سے ہیں۔ یعنی سابقہ نبیوں اور امتوں کے واقعات کو صحت کے دعوے کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں چیلنج کا انداز ہے۔ پھر یہ چیلنج اگر ایک ناخواندہ اور امی شخص کی طرف سے دیا جا رہا ہے تو یقین کرنا چاہیے کہ اس کے علم کا ذریعہ صرف وحی ہے اور وحی کی آمد نبوت کی دلیل ہے۔

اسلام سے قبل عربوں میں کاہنوں اور عراف کا خصوصی مقام تھا کیونکہ یہ غیب کی خبریں دیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا رابطہ شیاطین کے ساتھ ہوتا جو آسمان سے غیب کی خبریں چرا کر کاہنوں کو پہنچاتے۔ پھر یہ

کاہن ان خبروں میں جھوٹ ملا کر آگے بیان کرتے (روح المعانی، زیر آیت سورہ الفجر ۸۹:۱۸)۔

حضورؐ کے خطبات میں بھی غیب کی اخبار ہوتیں۔ اس معمولی سی مشابہت کی وجہ سے اہل مکہ نے حضورؐ کو کاہن قرار دیا۔ مگر قرآن مجید نے اس کی پرزور تردید کی۔ تردید کی وجہ یہ تھی کہ نبوت کا مقام کہانت سے بہت بلند ہوتا ہے۔ نبوت میں نہ جھوٹ ہوتا ہے اور نہ شیاطین سے رابطہ۔ کیونکہ پیغمبر کا رابطہ خدا کے ساتھ ہوتا ہے، اس کی ہر بات سچائی پر مبنی ہوتی ہے اور یہ صداقت ہی نبوت کی دلیل ہے۔

صبر و استقلال کی تلقین

نبوت و رسالت اس کائنات کا سب سے جلیل القدر منصب ہے۔ عہدہ جس قدر بڑا ہوتا ہے، ذمہ داریاں اور مشکلات بھی اتنی ہی شدید ہوتی ہیں۔ قوم کی اصلاح و تعمیر ایسا کٹھن مشن ہے کہ جس کی خاطر نبی اپنی تمام عمر صرف کر دیتا ہے اور تمام صلاحیتیں وقف کرتا ہے۔ مگر نتائج مایوس کن بھی نکلتے ہیں۔ قوم کی طرف سے انکار و تکذیب، پھر ضد اور ہٹ دھرمی کا رویہ، اس پیکر استقلال کے لیے بھی حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: حَتّٰی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ (یوسف ۱۲:۱۱۰) حتیٰ کہ رسول مایوس ہو گئے۔ یہ کسی ایک پیغمبر کا قصہ نہیں بلکہ انبیا کی مجموعی تاریخ اسی حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے۔

مکہ کی گلی کوچوں میں جب حضورؐ کے لیے یہی حوصلہ شکن مناظر پیش آئے تو آپؐ کی ہمت افزائی کے لیے اولوالعزم انبیا کی سیرتیں، قصص کی شکل میں دہرائی گئیں۔ ان کی امتوں کے واقعات بمقتضائے حال پیش کیے گئے جو آپؐ کی پریشانی کا مداوا اور آپؐ کے صبر و استقلال کے لیے سہارا تھے۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف ۴۶:۳۵) آپؐ صبر کریں جیسا کہ اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا۔

حضور علیہ السلام کے لیے پریشانی کی کئی نوعیتیں تھیں۔ آپؐ کی تبلیغ کے جواب میں اہل مکہ کا انکار، ضد اور پھر ظلم و ستم کا غیر متناہی سلسلہ تھا۔ اس موقع پر نوح علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا جن کا عرصہ تبلیغ کئی صدیوں پر مشتمل تھا جب کہ آپؐ کی تبلیغ کا دورانیہ تو چند سالوں پر محیط تھا۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ دہرایا گیا جس میں موسیٰ علیہ السلام، غلام قوم کے فرد تھے، جو فرعون اور اس کی قوم سے بری طرح دبی ہوئی تھی۔ بخلاف اس کے حضور علیہ السلام، قریش کے فرد تھے جو دوسرے خاندانوں کے ساتھ برابری کی پوزیشن رکھتا تھا..... فرعون کی سلطنت بھی سب سے بڑی تھی (تفہیم القرآن، الشعرا ۲۶:۱۵)۔ ایذا رسانی میں فرعون کا کردار اہل مکہ کی نسبت کہیں بدتر تھا۔ کیونکہ وہ کئی سالوں سے بنی اسرائیل کے لڑکوں کا قتل کر رہا تھا۔ اس اعتبار سے مکی مسلمانوں کی پوزیشن بہتر تھی کیونکہ اہل مکہ اپنے ظلم و ستم میں اس حد تک نہیں پہنچے تھے۔

صبر و استقلال کا ایک مرحلہ وہ ہوتا ہے جب تیر ستم اپنوں کی طرف سے چلیں کیونکہ ان کے زخم زیادہ

گھرے ہوتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا چچا ابولہب اس کردار کا نمایندہ تھا۔ برادران یوسفؑ کا قصہ ان زخموں کی مرہم تھا۔ انھوں نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو راہ کا پتھر سمجھ کر ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

مصائب کا نزول قدرت کی طرف سے ہوتا ہے جن کے ذریعے خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمایش کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام پر یہ حوادث بچپن سے گزر رہے تھے۔ پہلے باپ، ماں اور دادا بچپن ہی میں چل بسے۔ غم گسار اور ہمدرد چچا اور پھر مونس و غم غوار بیوی بھی داغ مفارقت دے گئی۔ نرینہ اولاد بھی فوت ہوگئی۔ کفار مکہ نے بغلیں بجائیں اور حضورؐ کو ابتر کے نام سے پکارا۔ ان حوادث کے لیے حضرت ایوب علیہ السلام کا نمونہ ہے جن کا سارا مال و اسباب تباہ ہوگیا، اہل وعیال رخصت ہو گئے۔ بیماری نے جسم چھلنی کر دیا مگر ایوب علیہ السلام ان جسمانی اور مالی مصائب پر تسلیم و رضا کا مجسمہ بنے رہے۔ اللہ کی طرف سے مدحت کا سرٹیفکیٹ ملا۔ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ط (ص ۳۸:۴۴) ہم نے اسے صبر کرنے والا پایا۔

صبر و استقلال کی ایک نوعیت وہ ہوتی ہے جب نبی اور اس کی قوم کی کش مکش نقطہ عروج کو پہنچتی ہے۔ دونوں فریق میدان جنگ میں صف آرا ہوتے ہیں۔ اس مرحلے کے لیے طالوت و جالوت کا قصہ رہنمائی کرتا ہے کہ طالوت کی چھوٹی سی فوج نے صبر و استقلال کے بل بوتے پر جالوت کی فوج کو شکست دے دی کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

بہرحال یہ مصائب قدرتی ہوں یا انسانی، اپنی ذات پر ہوں یا پیروکاروں پر، جسمانی ہوں یا مالی، تمام احوال و کیفیات کے لیے قرآن میں قصص موجود ہیں۔ جن میں ہر قسم کے آلام و مصائب کے لیے تسکین اور پریشانیوں کا مداوا موجود ہے۔

صفات الٰہی کی تشریح

ظاہر بیں اور مادہ پرست انسان، اس جہاں میں رونما ہونے والے ہر واقعے کو ظاہری اسباب و علل کے تحت دیکھتا ہے اور اس کی مختلف توجیہات پیش کرتا ہے۔ اگر وہ واقعہ کسی طرح بھی اس کی فکری دسترس میں نہ آئے، تو پھر بھی خدائی قدرت تسلیم کرنے اور اس پر ایمان لانے کے بجائے اس حادثہ کو محض بخت و اتفاق کا کرشمہ قرار دے کر بزعم خود سرخرو ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف خدا کو ماننے والے انسان کی یہ فطری خامی تھی کہ وہ محسوسات کا خوگر تھا۔ اس لیے کائنات کی کسی بھی عظیم، مادی چیز کو خدا کا مظہر ٹھیرا دیتا اور پھر اپنی عبودیت کا رشتہ اس سے استوار کر لیتا۔ اسلام نے جو الوہیت کا تصور دیا، وہ ذات کے اعتبار سے تو انتہائی تنزیہہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے انسان کی فکری رسائی سے باہر تھا مگر صفاتی حیثیت سے اس کی فہم سے بہت قریب تھا۔ اس لیے ذات باری سے ناطہ جوڑنے کے لیے حکم دیا کہ کائنات کو اس کی تجلیات کا مظہر سمجھو۔ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ اور اس کی

صفات کی معرفت حاصل کرو۔

قرآنی قصص بھی مذہب کی اسی عمومی تعلیم کی تشریح کرتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ○ (البقرہ ۲: ۲۴۵) اللہ سکیڑتا ہے اور پھیلاتا ہے، اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اس آیت میں خدا کی دو صفات بتلائی گئیں۔ ایک قبض اور دوسری بسط۔ پھر ان کی تشریح کے لیے قرآن نے طالوت و جالوت کا قصہ سنایا۔ جس میں طالوت کی مختصر سی فوج نے جالوت جیسے جابر و قاہر حکمران کو شکست دے دی۔ اس واقعے میں خدا کی دونوں صفات کی تشریح ہو گئی کہ طالوت کے لیے سلطنت کا بسط ہوا اور جالوت کے لیے قبض ہوا۔ اس طرح قرآنی قصص خدا کی صفات کی تشریح اور اس کی قدرت کا مظہر ہیں (تفسیر عثمانی، ذیل آیت بالا)۔

عقیدت و تعصب کے زیر اثر، یا لاشعوری طور پر، یا غلط فہمی کی بنا پر جلیل القدر ہستیوں کی طرف ایسے واقعات منسوب کر دیے جاتے ہیں جن کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کبھی ایسی مبالغہ آرائی کر دی جاتی ہے کہ اصل حقیقت مسخ ہو جاتی ہے۔ مثلاً حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ٹھیرا دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنالیا۔ اس مبالغہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے تھے ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی داغ دار کیے بغیر نہیں چھوڑا، اور داغ بھی ایسے سخت لگائے جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً شرک، جادوگری، زنا، جھوٹ، دغابازی۔ بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم جب اخلاقی و مذہبی انحطاط کا شکار ہوئی تو وہ تمام جرائم جو خود کرتے تھے انبیا کی طرف منسوب کر دیے (تفہیم القرآن، سورہ اعراف، زیر آیت ۱۵۰)۔ قرآن نے واقعات بیان کرتے وقت اس قسم کی تمام خرافات سے اجتناب کیا اور نہایت تعمیری انداز میں ان کی اصل شخصیت کو نمایاں کیا، جس سے حقیقت مکمل طور پر عیاں ہوئی۔

عظمت

انسان اس کائنات میں تمام مخلوق سے برتر اور مکرم و محترم بن کر آیا تھا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ، ہم نے بنو آدم کو عزت بخشی۔ علما کا ایک گروہ اس آیت کی وجہ سے فرشتوں پر انسانی فضیلت کا قائل ہے (تفسیر ابن کثیر، زیر آیت بنی اسرائیل ۷۰)۔ انسانی عظمت کے متعلق دوسری آیت ہے: خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ق (البقرہ ۲: ۲۹) یعنی سب کچھ تیرے لیے ہے اور تو خدا کے لیے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس حقیقی مقام و منصب کو فراموش کر بیٹھا۔ اس کی گراوٹ کی یہ انتہا تھی، کہ شجرو حجر کو معبود بنا کر اس کے آستانے پر جبیں فرسائی شروع کر دی۔ قرآن نے اپنے قصص کے ذریعے اس سرگرداں مسافر کو اصل سمت سے روشناس کرایا اور پھر اس نظریے کی مکمل تشریح قصہ آدم،

ملائکہ اور ابلیس سے کی۔ یہ قصہ آدم کی تکریم و تفضیل سے لبریز ہے کیونکہ اس میں پہلے تو آدمؑ کو خلافت سے سرفراز کیا' پھر علم کی دولت سے نوازا' پھر اسے مسجود ملائکہ بنا کر اس کی عظمت کو سہ چند کیا۔

اس عظمت کے مزید حسی مظاہرے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذات کے حوالے سے دیکھیے جن کے لیے ہوا مسخر کر دی گئی' جنوں کو مطیع کیا گیا (سبا ۳۴: ۱۲)۔ جانوروں کی بولی اور ان پر حکومت عطا کی گئی (النمل ۲۷: ۱۷)۔ پھر انسانی عظمت کا کھلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کا تخت حاضر کرنے کی فرمائش کی تو طاقت ور جن نے یہ تخت چند گھنٹوں میں لانے کی پیش کش کی مگر صاحب علم شخص نے اپنے علم کی بدولت اسے ایک سیکنڈ میں لاکر حاضر کر دیا (النمل ۲۷: ۴۰)۔ یہ واقعہ انسان اور اس کی علمی فضیلت کا شاہکار ہے۔

اکتاہٹ کا ازالہ

سورہ یوسف کے شان نزول کے متعلق عمومی روایات یہی ہیں کہ اہل مکہ نے اپنے طور پر یا یہود کے اشارے پر حضور علیہ السلام سے اس کی تفصیل دریافت کی جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کی آزمائش کریں (تفسیر ابن کثیر' سورہ یوسف آیت ۱)۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے شان نزول کا مقصد اکتاہٹ کا ازالہ تھا۔ یعنی جب صحابہ کرامؓ کفار کی مسلسل تعذیب سے پریشان تھے تو اس موقع پر ابن جریر کے بیان کے مطابق انھوں نے حضور علیہ السلام سے اپنی اکتاہٹ کا ذکر کیا اور قصص قسم کی کوئی بات سنانے کی درخواست کی' تو ان کی تفریح طبع کے لیے یہ سورۃ نازل ہوئی (تفسیر ابن جریر ۱۲: ۱۵۰)۔ علامہ آلوسی نے بھی اسی قسم کی ایک روایت سیوطی کے حوالے سے نقل کی مگر اس پر اعتراض بھی کیا (روح المعانی' ذیل سورہ یوسف آیت ۱) کہ یہ بات قرآنی عظمت کے شایان شان نہیں کہ اس میں مذکور کسی سورت یا آیت کا شان نزول' تفریح طبع ہو۔

حضرت یوسف کے قصے میں دیگر قصوں کے برعکس اتار چڑھاؤ بہت زیادہ ہے کہ موت کے دروازے پر دستک دینے والا بچہ آگے چل کر حکمران بن جاتا ہے۔ نیز اس قصہ میں عمومی زندگی کی وہ تمام جزئیات موجود ہیں جو قصے کو پرکشش بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی حقیقی قصہ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ریڈیو' ٹی وی کی موجودہ زندگی سے قبل یہ قصہ وسیع پیمانے پر پڑھا اور سنا گیا' مختلف لوگوں نے اسے منظوم کیا اور مقامی ثقافت کا حصہ بنا رہا۔

مشمولات قصص

عمومی تعلیمات کی طرح قرآنی قصص بھی مختلف قسم کی تعلیمات اور اصول پیش کرتے ہیں۔ یعنی قرآن مجید نے انبیا علیہم السلام کی تبلیغی مساعی اور مخالفین کی تباہی و بربادی کے واقعات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ

مادی زندگی کے دیگر اصول و ضوابط بھی پیش کیے۔ اگر قرآن مجید اپنے قصص میں صرف روحانی اجزا ہی پیش کرتا تو اس سے ترک دنیا کی تلقین اور رہبانیت کی تائید ہوتی' اور اس طرح قرآن مجید میں تعارض لازم آتا کہ اپنی عمومی تعلیمات میں تو دین و دنیا کی یکجائی کا قائل ہے مگر قصص میں دنیوی امور کو نظرانداز کر کے اس سے گریز کی ترغیب دی جا رہی ہے۔

اگر ہم غور کریں تو قصص سے متعدد قسم کی دنیوی تعلیمات و اصول مستنبط ہوتے ہیں:

۱- عمرانیات: کسی قوم اور معاشرے کی پہلی ضرورت امن و امان کا قیام اور لوٹ مار کا خاتمہ ہے۔ اس مقصد کے لیے ذوالقرنین کا قصہ رہنما ہے کہ یاجوج و ماجوج کے فساد سے بچانے کے لیے دیوار تعمیر کی۔

۲- حصول رزق: بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی اور رزق کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔ پھر آپ کی دعا کی بدولت خدا تعالیٰ نے بنیادی ضروریات کی یہ چیزیں انھیں وادی تیہ میں عطا کیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے قحط سے بچاؤ کے لیے موثر اور ٹھوس تدابیر اختیار کیں جس سے فراہمی رزق کی اہمیت کے ساتھ' اعلیٰ حکمران کے اوصاف بھی واضح ہوئے۔ اس سے قبل ان دونوں ضرورتوں کی اہمیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں بھی نظر آتی ہے۔ جب آپ خدا کے حضور التجا کرتے ہیں: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (البقرہ ۲:۱۲۶) اے میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا اور اس کے مکینوں کو پھل عطا فرما۔

۳- موجودہ دور میں خواتین کی معاشرتی حیثیت اور ان کے حقوق کا بہت چرچا ہے۔ قرآن مجید نے اپنے قصص میں مختلف مقامات پر خواتین کا ذکر خصوصی طور پر کیا۔ عورت کے متعلق دنیا میں رائج غلط نظریات کا خاتمہ کیا۔ مثلاً حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے قصے میں بتلایا کہ شجر ممنوعہ کھانے کا الزام صرف حوا پر نہیں بلکہ اس بھول چوک میں دونوں یکساں طور پر شامل ہیں جب کہ تورات اس معاملے میں حضرت حوا کو بنیادی طور پر قصوروار ٹھیراتی ہے۔

۴- حضرت مریم علیہا السلام کے قصے میں ان کی پاک دامنی و عفت کا بیان ہے تاکہ مخالفین کے بہتان کی تردید ہو۔ پھر ان کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد سے آپ کی عظمت شان ظاہر ہوتی ہے' کہ پیغمبروں کی طرف آنے والا فرشتہ ایک خاتون یعنی حضرت مریم کی طرف بھی آیا ہے۔

فرعون نہایت ظالم و جابر حکمران تھا۔ قرآن نے متعدد مقامات پر اس کی سرکشی کا ذکر کیا۔ جب کہ اس کی بیوی ایک صالحہ عورت تھی۔ قرآن نے خصوصیت سے اس کا ذکر کیا کیونکہ کفر کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس کے ایمان کی شمع روشن تھی۔ حضرت ابراہیم کی بیوی اور حضرت موسیٰ کی والدہ کا ذکر بھی قرآن مجید میں ہے جو کہ ان کے لیے اعزاز ہے۔ خطاکار عورتوں میں سے اس عورت کا ذکر بلا نام ہے جس نے

حضرت یوسف علیہ السلام کو ورغلانے کی کوشش کی۔ سورہ تحریم میں حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی کافرہ بیویوں کا ذکر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کے اپنے گھر سے اٹھنے والی ہدایت کی کرنیں' اگر اس جہاں میں ان کے قلوب کو روشن نہ کرسکیں تو دنیا میں اور روز قیامت' پیغمبر کا رشتہ ان کے کچھ کام نہ آئے گا (تفہیم القرآن' سورہ تحریم کا مقدمہ)۔

۵- سورہ یوسف میں چار خوابوں کا بیان ہے۔ یہ چاروں خواب سچ ثابت ہوئے۔ ایک خواب حضرت یوسف کا تھا اور تین خواب مصریوں کے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ کافر کا خواب بھی سچا ہو سکتا ہے اور وہ بھی مستقبل کی خبریں معلوم کر سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس انسانی شکل میں فرشتے آئے' آپ ان کے لیے بھونا ہوا بچھڑا لائے۔ اس سے مہمان نوازی کے آداب واضح ہوتے ہیں۔

۶- جو لوگ بے کس اور مجبور ہوں۔ وہ اصحاب کہف کی طرح اپنی ایمانی دولت کے تحفظ کے لیے کوہساروں میں خلوت نشینی کرلیں اور جو لوگ اقتدار کی نعمت سے بہرہ مند ہوں' وہ اپنے بھائیوں کی غلطیوں سے درگزر کرتے ہوئے انھیں معاف کر دیں۔

یہ چند مشمولات بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ قرآنی قصص عظیم المرتبت شخصیتوں کے عظیم القدر کارنامے ہیں۔ گو' ان واقعات پر صدیاں بلکہ ہزاریاں بیت چکی ہیں مگر آج بھی وہ نوع انسانی کے لیے سرمایہ حیات اور زندگی کی پُرپیچ راہوں میں روشن چراغ ہیں۔

ماہنامہ ترجمان القرآن

انٹرنیٹ پر دیکھا جا سکتا ہے

www.tarjumanulquran.com

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

"چند اخوانی ادیب" از ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی کی تیسری اور آخری قسط آیندہ کسی شمارے میں شائع کی جائے گی۔ (ادارہ)